بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

قرآن مجید نے خود اپنے اس دنیا میں نزول کے متعدد مقاصد بیان کیے ہیں۔ مثلاً یہ صداقت اور حکمت سے لبریز ہے، اس میں نصیحت حاصل کرنے والوں کے لیے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے عبرت کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ رُشد و ہدایت کا سرچشمہ، خیر اور بھلائی کا مخزن اور شرافت اور نیکی کا مبداء و منبع ہے۔ اس کی تعلیمات ہر خطا سے پاک، ہر کجی سے عاری، ہر عیب سے منزّہ اور ہر سُقم سے مامون ہیں۔ اس کی تصریحات بڑی جامع اور حکیمانہ ہیں اور ہر قسم کی غلطی سے مبرّا ہیں۔ جو بندگانِ خدا اپنے آپ کو روحانی عوارض سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، یہ کتاب انہیں ان سے بچاتی ہے اور جو ان میں مبتلا ہو کر صحت کے طالب ہوں انہیں شفا بخشتی ہے۔ یہ ایک عدل کی ترازو ہے جس میں ہر انسان اپنے افکار و اعمال کو تول کر ان کی صحیح قدر و قیمت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس کے ذریعہ کھرے کو کھوٹے سے بآسانی الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نور ہے جو انسان کے قلب و دماغ کو منوّر کرتا ہے اور جس کی مدد سے وہ اپنے آپ کو پہچانتا اور اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اس نوعیت کے بے شمار مقاصد بیان کیے ہیں لیکن اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سارے مقاصد ایک بنیادی مقصد کی فروعات ہیں۔ اس کتابِ الٰہی کا اصل مقصد ایک ہی ہے کہ وہ انسانوں کے اندر اپنے خالق اور مالک کا صحیح ادراک پیدا کرے، انہیں اس کائنات میں اپنے صحیح مرتبہ اور مقام سے آشنا کرے اور پھر اُسے یہ بتائے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ کس طرح صحیح بنیادوں پر رشتۂ عبودیت اُستوار کر سکتا ہے۔ خالقِ کائنات اور انسان کوئی ایسی بے ربط اکائیاں نہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو لہٰذا

کے درمیان عبد و معبود کا ایک خاص رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس رشتے کے مضمرات اور اس کے تقاضوں کی قرآنِ حکیم وضاحت کرتا ہے۔ انسانیت کے اندر آج تک جس قدر گمراہیاں پھیلی ہیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن سب کے پیچھے صرف ایک ہی چیز کام کر رہی تھی کہ انسان اپنے مالک کے صحیح ادراک میں ناکام ہوا، یا پھر وہ عبودیت کی اُن ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہ ہوسکا جو اپنے خالق و مالک کے مخلص بندے کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوتی ہیں۔

آیئے، اب یہ دیکھیں کہ قرآن مجید نے اس سلسلے میں انسانیت پر کتنے عظیم اور اَن گنت احسانات کیے ہیں۔

انسان پر کتابِ الٰہی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اُس نے انسان کی ہدایت اور اس کی فلاح و کامرانی کے لیے نہ صرف اُسے اپنے خالق اور مالک کا صحیح شعور اور احساس عطا کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں وہ جتنے غلط اور گمراہ کن تصورات کا شکار ہوسکتا تھا، اُن سب کے تباہ کن نتائج سے بھی اُسے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے۔

اس ضمن میں اُس نے انسان کے قلب و دماغ پر سب سے پہلے اس بنیادی حقیقت کا نقش ثبت کیا ہے کہ قدرت کا یہ وسیع و عریض کارخانہ یونہی محض بخت و اتفاق سے معرضِ وجود میں نہیں آگیا بلکہ یہ ایک زبردست اور بے مثال مُدبّر کے حسنِ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ یہ مُدبّر یکتا اور بے نیاز ہے اور اس نے کسی دوسری ذات اور قوت کو اپنی ذات، اپنی صفات اور اپنی تدبیر میں شامل نہیں کیا۔ پھر قرآن مجید نے انسان کو اس حقیقت سے بھی آشنا کیا ہے کہ خالق و مخلوق کے درمیان صرف یہی تعلق نہیں کہ خالق نے کائنات کو وجود بخشا بلکہ پیدائش کے بعد بھی یہ قادرِ مطلق اپنی مخلوق کی باقاعدہ نگرانی کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کائنات کے اندر جس کو جو کچھ مل رہا ہے اور جس طرح بھی اس کی پرورش ہو رہی ہے وہ سب براہِ راست اسی ربِّ عظیم کی صفتِ ربوبیت کی کرشمہ سازی ہے۔

یہ بے ہمتا ذات ہر جگہ موجود ہے، سب کچھ جانتی اور دیکھتی ہے، ہر آواز کو سنتی ہے، ہر ایک کے قریب اور ہر ایک کے ساتھ ہے۔ اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے۔ وہی ساری کائنات کا اصل بادشاہ اور حاکم ہے اور سب کچھ اُسی کے دستِ تصرف میں ہے۔ اس با اختیار اور لاشریک ہستی نے جو اپنے بندوں پر انتہائی مہربان اور رحیم ہے، ان کے افکار و اعمال اور اُن کے جذبات و احساسات کی صحیح تربیت کا بھی

انتظام کیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے اُس نے دنیا کی ہر قوم میں وہ ہادی بھیجے جنہوں نے نہ صرف تعلیماتِ الٰہی سے انسانوں کو روشناس کیا بلکہ اُن پر عمل پیرا ہو کر تعلیماتِ ربانی کے عملی مضمرات بھی اُن پر واضح کر دیتے۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں قرآن مجید کی تعلیم کا خلاصہ۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو تین چیزیں بالکل نمایاں طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک یہ کہ اس کائنات کے خالق کو دل کی گہرائیوں سے مانے بغیر اور پھر اس کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار کیے بغیر انسانی زندگی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا کی کسی مذہبی کتاب نے توحید کا اتنا واضح اور جامع تصور نہیں دیا جتنا کہ قرآن نے دیا ہے۔ دوسرے مذاہب میں جو اب ہمارے درمیان موجود ہیں، اوّل تو توحید کے نقوش ہی واضح نہیں ملتے اور اگر کہیں ان کا پتہ چلتا بھی ہے تو صرف اسی قدر کہ بس ایک خالق کو مان لیا جائے۔ اسلام نے اس سلسلے میں انسان کو یہ بتایا ہے کہ اس کو ایک ماننے کا مطلب یہ نہیں کہ بس اُس کے ساتھ کسی دوسرے کو ساجھی نہ بنایا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ جس طرح اپنی ذات، صفات اور اپنی تدبیر میں یکتا ہے بالکل اسی طرح اُس نے زندگی گزارنے کے جو ضابطے دیتے ہیں اس میں بھی کوئی اس کے مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے پہلی بار انسان کو اس حقیقت سے آشنا کیا ہے کہ جب خلق اُس کی ہے تو امر بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ اگر تکوینی زندگی میں انسان اور ساری کائنات اُس کی تابع ہے تو انسان کو اپنے دائرۂ اختیار میں بھی اُسی کے دیئے ہوئے ضابطوں کی پابندی کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر انسان اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہی سے قرآن مجید نے انسانی زندگی میں وحدت پیدا کی ہے۔ یہ فکر و نگاہ کا ایک عظیم انقلاب ہے جس نے تاریخِ انسانی پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

اسلام سے پہلے مذہبی زندگی کا تصوّر یہ تھا کہ انسان کسی مافوق الفطرت ہستی پر ایمان لے آئے اور اس کا نقش دل میں بٹھا کر بس اُسی سے اپنی روح کو سیراب کرتا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انسان کی اجتماعی زندگی کا مذہب سے کوئی سروکار نہ رہا۔ آپ اگر ان مذاہب کے ماننے والوں کے اندازِ زیست کا جائزہ لیں تو آپ

اُن کے معاشرے میں دو بالکل الگ الگ طبقے پائیں گے۔ایک وہ طبقہ جسے مذہب کے علاوہ دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں اور دوسرا وہ طبقہ جسے مذہب سے کوئی واسطہ نہیں۔چنانچہ ان مذاہب کا جب دائرہ کار پھیلا تو ایسی تہذیبیں پروان چڑھیں جو انسانیت کے بالکل دو متضاد نمونے پیش کرتی تھیں۔متمدن زندگی پر فسق و فجور، خود غرضی، جبر و استبداد اور ناانصافی کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہوتیں مگر "روشنی کے مینار" جنگلوں اور صحراؤں کا رُخ کر لیتے۔مذہب اور عملی زندگی کے اس افتراق نے انسانیت کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، شاید ہی کسی اور چیز نے پہنچایا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر زندگی کی عملی جدوجہد میں سے مذہب جیسے لطیف اور پاکیزہ عنصر کو خارج کر دیا جاتے تو باقی سوائے مادیت پرستی کے اور کوئی چیز بھی نہیں رہ جاتی۔مذہب کا یہ غلط تصور انسان کے اندر اتنا رچ بس گیا ہے کہ باوجود ہزار کوشش کے انسان کے ذہن سے یہ ابھی تک نہیں نکلا۔قرآن مجید نے اس غلط تصور کی بیخ کنی کی اور انسان کو بتایا کہ اُس کی پوری زندگی، اُس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں خالق کی امانت ہیں۔لہٰذا اس زندگی کے سارے گوشے جب تک احکامِ الٰہی کے مطابق منظم نہیں کیے جاتے اور انسان اپنے سارے معاملات میں خدا کی اطاعت کا رویّہ اختیار نہیں کرتا اس وقت تک وہ بندگی کے تقاضوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔پھر اُس نے انسان کی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا کہ اس کی رُوح اور جسم کے درمیان کوئی باہمی آمیزش ہے۔روح پر خدا کا تسلط ہے اور مادّی زندگی پر شیطان کا اختیار ہے۔خداوند تعالیٰ روح اور مادّے دونوں کا خالق ہے اور اُس نے انسان کو مادّی زندگی، روحانی ارتقا اور ترقی کے لیے عطا کی ہے اور رُوح کو مادّی زندگی کی پاکیزگی کا ذریعہ بنایا ہے۔اس کائنات میں انسان کسی جُرم کی پاداش میں نہیں اُتارا گیا بلکہ اُسے نیک تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے ساتھ اس کرۂ ارضی پر بھیجا گیا ہے تاکہ وہ اپنی اس حیاتِ مستعار میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کا مطیع و فرمانبردار بندہ ہے اور دل کی گہرائیوں سے اُسے اپنا رب مانتا ہے۔دین کے اس جامع تصور نے سیاست، معیشت، معاشرت، سائنس، ادب اور دوسرے علوم و فنون میں نہایت دُور رس تبدیلیاں پیدا کیں۔سیاست میں حق و صداقت کی عملداری، معیشت میں عدل و انصاف کا چلن، ادب میں اخلاقی اقدار کی ترجمانی اور سائنس میں تحقیق و تلاش کا ایک لازوال جذبہ صرف روحِ قرآنی کا کرشمہ ہے۔

قرآن مجید کو دنیا میں نازل ہوتے صرف چودہ سو سال گزرے ہیں۔ ان چودہ صدیوں میں انسانیت نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اُسے نگاہ میں رکھ کر قبل از قرآن کی ہزاروں برس کی تاریخ کا جائزہ لیں تو آپ کے سامنے قرآن مجید کا عظیم احسان خود بخود آ جائے گا۔ یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرآن کے نزول سے پہلے انسانیت جو فاصلہ صدیوں میں طے کرتی تھی اُسے اس کتابِ مبین کی روشنی میں اب وہ گھنٹوں میں طے کرنے لگی ہے۔

اہلِ مغرب اس ترقی کو نشاۃ ثانیہ کی کرشمہ سازی سمجھتے ہیں مگر یہ بالکل فریبِ نظر ہے۔ جن علوم کے احیاء کا ان لوگوں کو دعویٰ ہے وہ یونان اور رُوم کے علوم و فنون تھے مگر ہم جدید علوم اور ان کے درمیان غیر معمولی فرق دیکھتے ہیں۔ اگر اسے مسیحیت کا فیضانِ نظر سمجھیں تو معاملہ اور اُلجھ جاتا ہے کیونکہ اُس میں تو ترکِ دنیا کی تعلیم ہے۔ اس کے مطابق تو زندگی کی یہ ساری سرگرمیاں بالکل باطل اور لغو ہیں، جن سے ایک مذہبی آدمی کو ہمیشہ دامن بچا کر چلنا چاہیے۔

اب اگر یہ جدید افکار و نظریات یونانی اور رومی خیالات کا بھی چربہ نہیں اور عیسائیت کے بطن سے بھی پیدا نہیں ہوئے تو آخر یہ کہاں سے آ گئے ہیں؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ قرآن مجید نے دنیا میں آ کر لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں جو بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں، یہ سب اُسی کے مظاہر ہیں۔ اہلِ یورپ صلیبی جنگوں کی وجہ سے چڑ اور ضد میں آ کر اسلام کے حلقہ بگوش تو نہ بن سکے مگر اس دینِ حق نے جن حیات آفریں تصورات کو جنم دیا تھا ان کی لہریں دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچیں اور ہر جگہ انسانی معاشرے پر نہایت گہرے اثرات ڈالے۔ ان سارے اثرات میں پہلا اثر احترامِ انسانیت کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

روم، یونان، بابل اور نینوا کی پرانی تہذیبوں میں کوئی ایک تہذیب بھی ایسی نہیں جس میں یہ تصور ملتا ہو کہ انسان بحیثیت انسان ایک قابلِ تکریم ہستی ہے اور اس کے کچھ ایسے مقدس اور بنیادی حقوق ہیں جنہیں کسی صورت بھی پامال نہیں کیا جا سکتا۔ عیسائیت کے ہاں تو انسانیت کی تذلیل اور اُس کے پیدائشی گناہگار ہونے کے علاوہ اور کوئی دوسرا تصور ہی نہیں ملتا۔ رومی اور یونانی بھی انسان کو اجتماعیت کا ایک بے بس کل پرزہ سمجھتے تھے جسے وہ جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔ قرآن مجید نے آ کر انسانیت کو اُس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور اُسے بتایا کہ وہ اس کائنات میں خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ وہ کسی گناہ کی پاداش میں دنیا میں مقید اور گرفتار نہیں ہوا بلکہ

اُسے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ایک زرّیں موقع فراہم کیا گیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں بڑی عزت و احترام کا مستحق ہے۔ ادب میں اس تصور نے "رومانیت" کی صورت میں ظہور کیا اور انسان پہلی بار بحیثیت انسان شاعروں اور نثر نگاروں کی توجہ کا مرکز بنا۔ سیاست میں یہ تصور جمہوریت کی صورت میں نمایاں ہوا اور اس نے انسان کو یہ احساس دلایا کہ اُسے اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت اور پاسبانی کرنا چاہیے اور معاشرے کے سیاہ و سفید میں اس کی رائے کو بھی دخل ہونا چاہیے۔ انسان بھیڑوں کے گلے نہیں کہ انہیں اقتدار کی لاٹھی جس طرف چاہے ہانک کر لے جائے۔ معاشرت میں اس تصور نے اجتماعی عدل کے احساسات بیدار کیے۔

اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ ان تحریکات نے غلط رُخ اختیار کرنے کے بعد کون کون سے افسوسناک نتائج پیدا کیے۔ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ ادب میں جب رومانیت غلط سمت پر چل پڑی تو اس سے فحاشی اور خود پرستی نے جنم لیا۔ سیاست اور معیشت میں جب انفرادیت نے اپنی جائز حدود کو پھاند اتو سیاسی ظلم و استبداد اور معاشی لوٹ کھسوٹ اور اباحیتِ مطلقہ کا دَور دورہ شروع ہوا، لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یورپ کے جمود کو اگر کسی چیز نے توڑا تو یہ وہی تصورات تھے جو یورپ میں مسلمان لے کر آئے۔ ان تصورات کے اثر انداز ہونے سے پیشتر سیاست ایک ایسا ناپاک کھیل سمجھا جاتا تھا جس کو کھیلنے کا صرف شیطان کو حق ہے لیکن اسلامی تعلیمات کی وجہ سے سیاست کے بارے میں عوام کے رجحانات بدلے اور عوام نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ پھر سیاست میں اجتماعی عدل کا جو تصور پیدا ہوا وہ سراسر اسلامی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ عیسائیت میں تو قیصر کے اس حصے میں کسی انصاف، کسی بھلائی اور کسی خیر کی توقع رکھنا ہی بے سود ہے۔ اُس کے نزدیک یہ زندگی وہ شعبہ ہے جس میں سوائے مکر و فریب، جور و استبداد اور ناانصافی کے اور کوئی چیز ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر شیطان کے اس کارخانے کو خدا کی مغضوب مخلوق یعنی بادشاہوں اور فرمانرواؤں کے سپرد رہنا چاہیے۔ عیسائیت میں عدل و انصاف کا بلاشبہ تصور ملتا ہے مگر وہ صرف روحانی بادشاہت میں ہے۔ دنیا کے سیاسی معاملات میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن نے حیاتِ انسانی کے اس ملعون اور ناپسندیدہ شعبے کے اندر تقدیس پیدا کی اور انسان کو بتایا کہ اس شعبے کو اگر تعلیماتِ الٰہی کے مطابق ڈھال دیا جائے تو یہ روحانی بادشاہت کی طرح مقدس اور پاکیزہ

ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعے انسانوں کے اندر خیر اور بھلائی پیدا کی جاسکتی ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ غیر مسلم بادشاہوں میں بھی بعض بڑے نیک لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے رعایا کے حقوق کا بے حد خیال رکھا اور اسے ہر طرح آرام اور سکون پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ بات بالکل درست ہے لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے حضرات غالباً اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اگر ان خدا ترس اور نیک فرمانرواؤں نے رعایا کے ساتھ معاملہ کرنے میں خدا خوفی کا ثبوت دیا تو یہ محض اُن کی خدا ترسی تھی ورنہ اس معاملے میں وہ کسی ضابطے کے پابند نہ تھے اور نہ رعایا کے کسی حق کے احترام میں انہوں نے ایسا کیا۔ یہ اُن کا ایک انفرادی طرزِ عمل تھا۔ اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو مستقل بنیادی حقوق دیئے ہیں جنہیں کسی فرد، ادارے یا حکومت کو سلب کرنے کا حق نہیں اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ خدا اور خلق کی نظر میں غاصب ہے۔ اگر بعض غیر مسلم بادشاہوں نے رعایا کے ساتھ خیر اور بھلائی کا رویہ اختیار کیا تو یہ اُن کا احسان تھا مگر مسلمانوں کے ہاں رعایا کے حقوق کی حفاظت اور پاسداری فرمانرواؤں کے فرائض میں داخل ہے اور جن حکمرانوں نے اس سے اغماض برتا انہوں نے خواہ کتنی وسیع وعریض سلطنتیں فتح کیں مگر اسلامی تاریخ میں وہ عزت و احترام کا کوئی مقام حاصل نہ کرسکے۔

قرآن نے حکمرانی کے جو اصول انسانیت کو دیئے ہیں اُن کی بنیاد پر مسلمانوں نے لاتعداد کتابیں تصنیف کیں جن میں رعایا کے حقوق و فرائض اور فرماں رواؤں کی ذمہ داریوں کی پوری طرح نشاندہی کی گئی۔ دنیا کی کوئی غیر مسلم قوم اس نوعیت کی کوئی ایک کتاب بھی نہیں دکھا سکتی جس میں کسی کتابِ مقدس کی روشنی میں عملاً ایک سیاسی زندگی کی مثالی طور پر تشکیل کی گئی ہو اور پھر اسے ایک نمونہ سمجھتے ہوئے حکمرانی کے اصول و ضوابط مدون کیے گئے ہوں۔

قرآن مجید نے انسانی فکر و نگاہ میں دوسرا بڑا انقلاب یہ پیدا کیا کہ بنی نوع انسان کے درمیان شریف اور کمین کی تفریق مٹا کر عزت اور ذلت کی بنیاد حسب و نسب اور رنگ و نسل کے بجائے ایمان اور اخلاق کو قرار دیا۔ اس کا یہ اعلان کتنا انقلاب انگیز ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات - ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے جو اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے وہی معزز تر ہے۔

پھر سورۃ النساء کا آغاز ہی اس حقیقت کے بیان سے کیا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ -

اے لوگو! اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔

یہ دو آیتیں ہم نے بطور مثال پیش کی ہیں ورنہ قرآن مجید نے ایک مقام پر نہیں متعدد مقامات پر اسی حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ انسان نے انسان کے درمیان شریف اور کمین کی جو تفریق پیدا کر رکھی ہے اور رنگ و نسل کے امتیازات کی وجہ سے جو گروہ بندیاں قائم کر رکھی ہیں یہ سراسر باطل ہیں۔ دنیا کے سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں اور اس بنا پر اُن کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ ہاں ان کے اندر اگر امتیاز کیا جا سکتا ہے تو وہ صالح اعمال کی بنا پر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی خدا سے ڈرنے والے اور انسانیت کی خیر اور بھلائی چاہنے والے، خدا سے غافل اور انسانیت کے دشمنوں اور بدخواہوں سے ممیز اور ممتاز ہیں۔

وحدتِ نوعِ انسانی، اسلام میں ایک نظریہ نہیں بلکہ مؤکد حقیقت ہے۔ اس نے اُن تمام جاہلی نظریات کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جو انسانوں کی مختلف نسلوں کو مختلف مورثوں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ پھر اس نے مختلف قبائل، خاندانوں اور نسلوں کے بارے میں یہ بات بتا کر کہ ان کا مقصد باہمی تعارف کے علاوہ اور کچھ نہیں جدید و قدیم جاہلانہ قوم پرستی اور نسل پرستی کا قلع قمع کیا ہے اور انسان کے دل و دماغ میں اس بات کو راسخ کیا ہے کہ اللہ کے ہاں شرف و مقبولیت کا تمام تر دارومدار صرف نیکی پر ہے۔ یہ نسلی، قومی اور آبائی غرور سب باطل اوہام ہیں جن میں مبتلا ہو کر انسان نے انسانیت کی فطری وحدت کو پارا پارا کیا ہے۔ انسان جس نتیجے پر لمبی تحقیقات کے بعد آج بیسویں صدی میں پہنچا ہے اُس حقیقت کو قرآن مجید نے آج سے چودہ سو برس پہلے واضح کر دیا تھا۔ یونسکو نے جولائی ۱۹۵۰ء میں ماہرینِ حیاتیات کی ایک رپورٹ شائع کی تھی جس میں اس امر کا

جائزہ لیا گیا کہ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔اس رپورٹ نے قرآن مجید کی اس صداقت کا مندرجۂ ذیل الفاظ میں اعتراف کیا۔

"سارے سائنس دان اب اس بات پر متفق اور متحد ہیں کہ انسانیت اصل کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور سارے انسان ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔حیاتیات کے مطالعہ سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں انہوں نے عالمگیر برادری کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔انسان فطرتاً دوسرے انسان سے تعاون اور محبت کا خواہاں ہے اور اگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو تو اسے دکھ ہوتا ہے۔انسان کے اندر معاشرتی احساسات پائے جاتے ہیں اور وہ ابنائے جنس کے تعاون ہی سے ان کی تسکین کر سکتا ہے۔جب انسان اور انسان کے مابین اس فطری رشتہ اخوت کی نفی کی جاتی ہے تو پھر سوائے انتشار کے اور کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔اس نقطۂ نظر سے ہر انسان دوسرے انسان کا دمساز ہے کیونکہ ہر فرد انسانیت کی وسیع برادری کا ایک رکن ہے۔

قرآن مجید نے ہمیں صرف وحدت انسانی کا ہی درس نہیں دیا بلکہ اُس نے وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس کی بھی تعلیم دی ہے۔اُس نے جہاں انسان کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں وہاں اس نے اس حقیقت کو بھی منکشف کیا ہے کہ حاکم مطلق نے بندوں کی ہدایت کے لیے جو دین انہیں عطا کیا ہے وہ اپنی اساس اور بنیاد کے اعتبار سے ایک ہی ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔اس کے اساسی تصورات میں اگر مختلف گروہوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو یہ اُن کی کم فہمی اور ناسمجھی کا نتیجہ ہے۔مالک الملک نے اپنے بندوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے اور یہی بات قرینِ قیاس بھی ہے۔جب ہدایت کا سرچشمہ ایک ہے جب انسانوں کے مابین بحیثیت انسان کوئی فرق و امتیاز نہیں تو لامحالہ ان کے لیے ہدایت کا ضابطہ اور فلاح و کامرانی کا راستہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔اسی حقیقت کو قرآن مجید نے یوں ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ	ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔(پھر یہ حالت باقی نہ رہی، اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے

الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا
فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ
بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔
(البقرہ - ۲۱۳)

نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور اُن کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور ان اختلافات کی وجہ کچھ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہ گیا تھا، نہیں، اختلاف ان لوگوں نے کیا، جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایت پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

وحدتِ انسانی کی طرح وحدتِ پیغامِ الٰہی بھی ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا قرآن مجید نے بار بار اظہار کیا ہے۔ فکری انتشار اور گروہی تعصبات اسلام کے نزدیک قطعاً کوئی پسندیدہ چیزیں نہیں۔ قرآن مجید نے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں باری تعالیٰ نے اپنے ہادی نہ بھیجے ہوں۔ یہ سارے ہادی خدا کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور یہ سب کے سب ایک ہی پیغام کے داعی، ایک ہی تعلیم کے حامل، ایک ہی راستہ کے رہنما اور ایک ہی دعوت کے علمبردار تھے۔ ان کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ سب نبوت کے مقدس سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھے۔ قرآن مجید نے ان بزرگ و برتر ہستیوں کی صداقت اور ان کے پیغام کی حقانیت کی تصدیق کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ سب جو تعلیمات لیکر دنیا میں آئے تھے ان پر ایمان لائے بغیر ایمان کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس کی اس سے بڑی اور بہتر مثال اور کہاں مل سکتی ہے کہ انسان ایک خدا کی مخلوق، ایک آدم کی اولاد اور ہدایت کے ایک ہی سرچشمے سے ہدایت پانے والا ہے۔

حق و صداقت کے دشمنوں نے قرآن مجید کے اس ارشاد کی، کہ ابتدا میں تمام بنی نوع انسان ایک ہی امت تھے، تکذیب کے لیے بڑے عجیب و غریب فلسفے گھڑے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان سب سے پہلے مظاہر پرست تھا۔ اس مظاہر پرستی سے اُس نے بُت پرستی کا سبق سیکھا اور بالآخر اُس نے ان دیکھے خدا کی پرستش شروع کی

لیکن حال ہی میں اس موضوع پر جو تحقیقات ہوئی ہیں انہوں نے ان سب اوہام کو باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان فطرتاً موحّد، ایک خدا کا پرستار اور کفر و شرک سے بیزار ہے۔ اس کا اصل دین ہمیشہ توحید ہی رہا ہے اور اس نے نفسانی خواہشات اور غلط مقاصد کے تحت اس سے منہ موڑا۔ ہم یہاں تاریخ مذہب کے چند نامور ماہرین کی تصریحات پیش کرتے ہیں:

سر چارلس مارسٹن جو دَورِ حاضر کا نامور ماہرِ آثارِ قدیمہ اور انسانیات ہے اُس نے اس حقیقت کا مندرجۂ ذیل لفظوں میں اعتراف کیا ہے:

"انسان کا اصل مذہب شرک نہ تھا بلکہ توحید تھا۔ ارتقاءِ مذہب کے نظریہ کو انسانیات اور آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے باطل قرار دیا ہے۔"

ایک دوسرا مفکر لینگڈن (LANGDN) اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"میرے نزدیک مذہب کی پوری تاریخ توحید سے شرک کی طرف انسان کے زوال کی داستان ہے۔ دنیا کے قدیم کتب خانوں میں ہمیں جو پرانی لوحیں اور تختیاں ملی ہیں انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان شروع میں توحید پرست اور آخرت پر ایمان رکھنے والا تھا۔"

قرآن مجید کے عظیم احسانات میں عورتوں کو بھی خاصا حصّہ ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو طبقہ جتنا مظلوم تھا باری تعالیٰ نے اتنا ہی اُسے مظلومیت سے نجات دلانے کا التزام فرمایا۔ خدا کی اس آخری کتاب کے نزول سے پیشتر عورت کی حیثیت محض ایک کھلونے یا سامانِ عیش سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ وہ بے جان اشیاء کی طرح ایک مرد سے دوسرے مرد کی تحویل میں چلی جاتی اور کسی فرد کے انتقال کے بعد اس کے وارث کے پاس دوسرے اثاثے کی طرح منتقل ہو جاتی۔ یہ خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکہ تصوّر کی جاتی اور ظالم والدین اسے ایک ناروا بوجھ سمجھ کر اُسے زندہ دفن کر دیتے۔ اُس کے متعلق لوگوں کے اندر یہ بات مشہور تھی کہ اس کا خمیر گناہ سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اُس نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السّلام کو جنت سے نکلوا دیا تھا۔ ایک مرد جتنی عورتوں کو چاہتا بلا تکلّف اپنے حرم میں لے آتا، نکاح محض ایک رسم تھی جس میں نہ تو کوئی تقدیس تھی اور نہ اس سے کسی ذمّہ داری کا تصوّر وابستہ تھا۔ آپ کو اگر عورت کی مظلومیت کا کچھ اندازہ

کرنا مقصود ہو تو رابرٹسن سمتھ کی کتاب "رشتہ اور نکاح عرب قبل از اسلام" کا مطالعہ کیجیے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ صنف نازک کس قسم کے ظلم و استبداد کا شکار تھی۔ ایک عورت کو بیک وقت کئی کئی مردوں کی بیوی بن کر رہنا پڑتا اور بسا اوقات پورے خاندان کے مرد اُسے اپنی ہوسناکی کا ہدف بناتے۔ اس کا کام صرف اسی قدر تھا کہ وہ مرد کی تفریح کا سامان پیدا کرے۔ مشہور مفسر زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں سورۃ التکویر کی ایک آیت کی تصریح کرتے ہوئے وہ طریقہ بیان کیا ہے جس کے مطابق بچیاں موت کے گھاٹ اتاری جاتی تھیں۔ وہ فرماتے ہیں :

"جب بچی کی عمر چھ برس کی ہو جاتی تو خاوند بیوی کو کہتا کہ اسے خوشبو لگاؤ اور زیور سے آراستہ کرو۔ پھر یہ خاوند اس بے بس بچی کو اپنے رشتہ داروں کے ہاں ملاقات کے لیے لے جاتا اور آخر جنگل کا رُخ کرتا۔ وہاں ایک گڑھا کھودتا اور اس مظلومہ کو اس کے کنارے کھڑے ہونے کا حکم دیتا اور اُس سے کہتا کہ تم اس گڑھے کی طرف غور سے دیکھو۔ اس حالت میں اُسے پیچھے سے دھکا دے کر اس گڑھے میں گرا دیتا اور اس کے اوپر مٹی ڈال کر اُسے زمین کے ساتھ ہموار کر دیتا۔

جب ایک عورت کسی خاندان میں چلی جاتی تو اُس کی آزادی یکسر سلب ہو جاتی۔ وہ اُس خاندان کی ملکیت تصور ہوتی۔ اُسے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ملنے کی قطعاً اجازت نہ ہوتی اور وہ بالکل ایک بے جان مخلوق کی طرح بڑے عذاب میں زندگی بسر کرتی۔ کامل المبرّد میں بنی عامر کی ایک عورت کا نوحہ درج ہے جو اُس نے اپنے نکاح پر پڑھا۔ اس سے عورت کی بے بسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :

"بہن کو اپنے بھائی کی مدح و ستائش سے دامن کش ہو جانا چاہیے۔

اب بیٹی کو باپ کی موت پر نوحہ خواں ہونے سے بھی باز رہنا چاہیے، کیونکہ اب وہ ایک ایسی جگہ منتقل ہو گئی ہے جہاں اس کی آزادی مسلوب ہے۔

اس کے لواحقین نے اُسے دنیا کے ایسے دُور دراز گوشے میں بھیج دیا ہے جہاں وہ اپنے کسی عزیز سے مل نہیں سکتی۔"

ابن جریر نے اپنی مشہور تفسیر طبری میں وہ طریقہ بیان کیا ہے جس کے تحت عورت اپنے خاوند کی وفات کے بعد اُس کے وارثوں کی طرف منتقل ہوتی۔ بیوہ کے حقوقِ مالکانہ حاصل کرنے کے لیے اُس پر ایک چادر ڈال

دی جاتی جو اس بات کی علامت تھی کہ اب یہ عورت چادر ڈالنے والے کے قبضے میں آچکی ہے۔ اگر یہ بدنصیب خوبصورت ہوتی تو اس کا نیا مالک اُسے اپنے پاس رکھ لیتا، ورنہ وہ اُسے دوسرے ہاتھوں میں بڑی بے تکلفی کے ساتھ فروخت کر دیتا۔

عورت کو جب ذی رُوح مخلوق ہی تصور نہ کیا جاتا تھا اور وہ جب انسانیت کے دائرے سے ہی خارج خیال کی جاتی تھی تو اُس کے احترام اور اُس کے حقوق کا سوال آخر کس طرح پیدا ہو سکتا تھا۔ وراثت میں حصّہ تو خیر بڑی چیز ہے، اُس کا انسانیت میں بھی کوئی حصّہ نہ تھا۔ وہ شیطان کی اولاد تصور کی جاتی جس کے ذمہ صرف یہی کام تھا کہ وہ انسان کے سفلی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرے۔

قرآن مجید نے اس مظلوم طبقے پر اس قدر احسانات کیے ہیں کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں اُس نے سب سے پہلے اس بات کی تردید و تکذیب کی کہ عورت کا تعلق شیطان سے ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ عورت بھی اسی طرح ایک ذی رُوح اور قابلِ احترام مخلوق ہے جس طرح کہ مرد کیونکہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں دونوں پر اپنے اعمال کی الگ الگ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور کسی ایک کو دوسرے کے افعال کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ (النساء، آیت ۳۲)

اسی طرح قرآن مجید نے میراث میں لڑکی کو اپنے بھائی کا حصہ دار بنایا اور خاوند کی وفات کے بعد اُس کے ترکے میں سے اُسے ایک مستقل حصّے کا وارث قرار دیا۔ ماں باپ پر اُس کی پرورش کی ذمہ داریاں عائد کیں اور اُن سے عہدہ برا ہونے کی انہیں تاکید کی اور والدین سے رخصت ہونے کے بعد جب وہ رشتۂ مناکحت کے تحت اپنے خاوند کے گھر میں منتقل ہوئی تو وہاں بھی اُس کے مستقل حقوق کا تعین کیا گیا۔ مرد پر اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ڈالی گئی، اور مرد کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ اس کے ساتھ نرمی اور بھلائی کا برتاؤ کرے۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتے وقت اس کی رضامندی کو ضروری سمجھا گیا اور اُسے یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ اپنے خاوند کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی تو خلع کے ذریعہ اُس سے علیحدگی اختیار کرلے۔

قرآن مجید کے عورت پر احسانات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے یہ صفحات ناکافی ہیں۔ ہم یہاں ایک غیر مسلم خاتون کے تاثرات نقل کرتے ہیں :

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پیشتر عورت معاشرے میں نہایت ذلیل چیز تصور کی جاتی تھی اُس کی حیثیت بے جان اشیاء کی سی تھی۔ یہ سب کچھ یہودی راہبوں کی تعلیمات کا نتیجہ تھا..... ذلت و خواری اس کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ گھر کے دوسرے سامان کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی، اور ہر وارث جس طرح چاہتا اُس سے فائدہ اٹھاتا۔ اس کی محافظت اور نگہبانی کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ کوئی قانون ایسا نہ تھا جو اُسے پناہ دیتا۔ ترکہ میں اُس کے لیے کوئی حصہ نہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ اللہ وسلم کو عورت کی یہ مظلومیت کسی طرح گوارا نہ تھی۔ انہوں نے اس بے بس مخلوق کو ذلت کے مقام سے اٹھا کر مردوں کے دوش بدوش عزت و احترام کے مقام پر کھڑا کیا۔ اور مرد اور عورت کے درمیان مساوات کی تعلیم دی۔ انہوں نے مردوں کے اپنے حرم میں عورتوں کے بے قید داخلہ پر پابندی لگائی۔ انہوں نے بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم کا یکسر خاتمہ کیا۔ انہوں نے رشتۂ نکاح کو تقدس دیا۔ عورتوں کو وراثت اور خلع کے حقوق عطا فرمائے۔ مرد پر عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داریاں عائد کیں۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کرنے والوں اور اُن کی معاونت اور دستگیری کرنے والوں کی خدا کے ہاں اجرِ عظیم کا مستحق ٹھیرایا۔ حضورؐ نے تہذیب کے ارتقاء اور ترقی میں عورتوں کی خدمات کو پوری طرح تسلیم کیا اور اس بنا پر اُن کی روحانی اور اخلاقی نشوونما کو نظامِ اسلامی میں بہت زیادہ اہمیت دی۔ اُس دور میں جب حضورؐ دنیا میں تشریف لائے، دنیا کے تمدن میں یہ غیر معمولی انقلاب تھا اور اس سے جو تبدیلیاں ہوئیں انہیں کسی دور میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

(مس فلوری، "مسلم ورلڈ" نیویارک جنوری ۱۹۴۰ء)

یہ تبدیلیاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے محض قانونی تبدیلیاں ہیں۔ عورت کے بارے میں قرآن مجید نے فکر و نگاہ کے زاویوں کو کس طرح بدلا ہے یہ خود ایک مستقل موضوع ہے جو بڑی تفصیل چاہتا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک دو گزارشات پیش کرتے ہیں۔ سورۃ النساء میں جس میں زیادہ تر عورتوں اور یتیموں کے حقوق بیان کیے گئے ہیں، باری تعالیٰ نے بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھائی ہے کہ وہ اُن کی ساری کارروائیوں کو جاننے والا، دیکھنے والا اور اُن کی نگرانی

کرنے والا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنی یہ صفت غنی مرتبہ یہاں دُہرائی ہے غالباً کسی اور مقام پر نہیں دُہرائی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گھریلو معاملات اس نوعیت کے نہیں ہوتے کہ وہ سارے قانونی پابندیوں کی گرفت میں آ سکیں خصوصاً خاوند اور بیوی کا رشتہ تو ایسا ہے کہ کوئی قانونی پابندی اسے سنوار نہیں سکتی۔ لہٰذا ان تعلقات میں خدا کا خوف ہی ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے۔ اور دونوں فریقوں کو یہ حقیقت پوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ اگرچہ قانون کی گرفت سے تو بچ سکتے ہیں، یا ایک فریق دوسرے فریق پر کسی حیلۂ قانونی کے ذریعے سے زیادتی تو کر سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے جو علیم و خبیر ہے اس کا یہ فعل کس طرح چھپا رہ جائے گا۔ قرآن مجید نے رشتۂ مناکحت کو نہ صرف مقدس بنایا ہے بلکہ اس نے قادر مطلق کو اس پر گواہ بھی ٹھیرایا ہے۔

پھر اس کتابِ الٰہی میں عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ قرآن مجید کی رُو سے عورت نہ تو کھلونا ہے اور نہ مرد کے لیے سامانِ عیش، بلکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو اُس کے لیے آرام و سکون کا نہایت مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں ہے: جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا۔ پھر سورۂ روم میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے: وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً۔ ان آیات سے تین باتیں بالکل کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ عورتیں ترکیبِ حیات میں مردوں کی مثل ہی ہیں، یعنی انہی جیسی خواہشات، جذبات اور احساسات رکھنے والی مخلوق ہیں۔ دوم یہ کہ اُن کی غایتِ آفرینش یہ ہے کہ وہ مردوں کے لیے سرمایۂ راحت و تسکین و باعثِ سکونِ خاطر ہیں۔ سوم یہ کہ مرد اور عورت کے تعلقات کی بنیاد باہمی محبت، اخلاص اور ہمدردی پہ ہونی چاہیے۔ قرآن مجید نے عورت کو شیطان کی اولاد، چڑیل، مرد کو گناہ کی ترغیب دینے والی یا اُس کی کنیز نہیں ٹھیرایا بلکہ اُسے اس کی انیس اور رفیق قرار دیا ہے۔

قرآن نے عورت کے وجود کا جو مقصد بیان کیا ہے اُسے اگر نگاہ میں رکھ کر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عورت آج بھی اُسی طرح مظلوم ہے جس طرح کہ آج سے چودہ سو برس پہلے مظلوم تھی۔ مغربی عورت کو اپنی ترقی اور آزادی پر بڑا ناز ہے لیکن یہ ترقی محض فریبِ نظر ہے۔ مرد آج بھی اُسے اپنی ہوسناکی کا نشانہ بنا رہا ہے۔ (باقی ص ۶۲ پر)

(بقیہ اشارات)

اُسے اپنے عشرت کدے کی زینت کا سامان سمجھتا ہے اور اُسے محض اپنی جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ خیال کرتا ہے اور پھر مزید ظلم یہ ڈھاتا ہے کہ اس معاملے میں اپنے آپ پر کوئی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یورپ میں عورت کا جو حشر ہو رہا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہم یہاں مشہور مغربی خاتون اینی بلینٹ کے احساسات پیش کرتے ہیں:

"مغرب میں اگرچہ یک زوجگی کے چرچے ہیں لیکن وہاں درحقیقت تعددِ ازواج کی گرم بازاری ہے۔ ایک ایسی رسم جس میں مرد پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جب مرد کا دل ایک عورت سے سیر ہو چکتا ہے تو وہ اُسے دھتکار دیتا ہے اور وہ بیچاری بازاری عورت بن جاتی ہے۔ مرد اس سلسلے میں کسی ضابطے کا پابند نہیں۔ اس مظلوم عورت کی حالت اُن گھرانوں سے ہزار گنا بدتر ہوتی ہے جہاں مرد کے عقدِ نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں ہوں۔ تعددِ ازواج کی صورت میں کم سے کم مرد کی محافظت اور کفالت تو کرتا ہے۔ جب ہم مغربی شہروں میں ہزاروں بے سہارا عورتوں کو رات کے وقت بے یار و مددگار سرگرداں دیکھتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ مغرب کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تعددِ ازدواج کی وجہ سے اسلام کے خلاف زبانِ طعن کھولے۔ کیا عورت کے لیے یہ بات بدرجہا بہتر اور باعثِ آرام اور سکون نہیں کہ وہ سوکنوں کے ساتھ مل کر ایک مرد سے وابستہ رہے اس کی آغوش میں جائز اولاد ہو اور معاشرے میں وہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جائے۔ اور اس طرح اُس ظلم سے بچے جس کے تحت وہ فریب کا شکار ہوتی، گلیوں اور بازاروں میں ماری ماری پھرتی، اور ناجائز اولاد کو جنم دیتی اور بے سہارا اور بے بس ہو کر زندگی بسر کرتی ہے جس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا اور ہر وقت کسی مرد کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہے۔ ماں کا مقدس مقام حاصل کرنے کی اس میں سرے سے صلاحیت ہی ناپید ہو جاتی ہے اور ہر جگہ اس کے خلاف نفرت اور بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔